نے ان کو متعدد خطوط میں حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہنے کی ہدایت فرمائی"، اس کی وجہ حضرت مفتی صاحب کی جلالتِ شان کے ماسوا سلسلۂ طریقت کا اشتراک اور مناسبت بھی تھی، والد ماجد نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "نزہۃ الخواطر" کی (جو آٹھ جلدوں میں عربی میں غیر منقسم ہندوستان کے ہزار بارہ سو سال کے اسلامی دور کے مشاہیرِ ہند اور ممتاز شخصیتوں کے تعارف و تذکرہ پر مشتمل ہے آٹھویں جلد میں حضرت مفتی صاحب کا بلند الفاظ میں قدرے شرح وبسط کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ مجھے حضرت مفتی صاحب کی زیارت کا شرف تو حاصل نہیں ہوا، کہ ۱۳۴۷ھ میں آپ کی وفات ہوگئی، اور میں دیوبند ۱۹۳۱ء (۱۳۵۰ھ) میں حاضر ہوا، اور مولانا مدنی رحمۃ اللہ کے درسِ حدیث میں شرکت کی سعادت حاصل کی، دیوبند کے ایک سفر کے موقعہ پر مفتی صاحب کے عمِ محترم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ دیوبند ہی تشریف رکھتے تھے، مولانا مدنیؒ کے دولت کدہ پر ان سے نیاز حاصل ہوا، پھر کئی بار دولت خانہ پر بھی حاضر ہوا، مولانا کے ان حواشی کے بارے میں جو حضرت شیخ الہند کے ترجمۂ قرآن پر ان کے قلم سے ہیں، میں نے اپنے تاثرات اور بحیثیت مدرسِ تفسیر کے اپنے تجربہ کا اظہار کیا۔ اور ان کی افادیت اور علمی وتحقیقی امتیاز کے بارے میں اظہارِ خیال کیا، تو مولانا کی خصوصی توجہ ہوئی اور خصوصی شفقت فرمانے لگے، اس وقت تک جہاں تک یاد ہے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے ملاقات اور تعارف کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

مفتی صاحب کے نیاز اور براہ راست ملاقات کا سلسلہ (جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے) ۱۹۴۴ء کے بعد سے شروع ہوا، جب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ کی خدمت میں پہلی بار حاضری ہوئی اور پھر مستقل ربط قائم ہو جانے کی بناء پر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دہلی کا سفر پیش آتا رہا، اس وقت تک دہلی کے نامور اور ممتاز علماء اور علمی اشتغال اور سیاسی ذوق رکھنے والے فضلاء (حضرت مفتی کفایت اللہ

صاحبؒ کو مستثنیٰ کر کے) مولانا سے زیادہ متعارف و مانوس نہیں تھے۔ اور ان کی نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی، میں اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کے باوجود دارالعلوم ندوۃ العلماء سے درس و تدریس کا انتساب رکھنے اور کچھ لکھنے پڑھنے کی مناسبت سے دہلی کے ان علماء اور مولانا کے درمیان رابطہ بننے کی کوشش کرتا تھا۔ اُسوقت جامع مسجد پر مولانا سمیع اللہ صاحب مرحوم کا مکتبہ عزیزیہ باذوق و سنجیدہ علماء اور علمی و سیاسی ذوق رکھنے والے احباب کی (جن کا زیادہ تر جمعیۃ العلماء سے تعلق تھا) نشست گاہ اور بزمِ احباب تھی، مولوی سمیع اللہ صاحب کے اخلاق، خوش گفتاری اور زندہ دلی کی وجہ سے میری بھی آمدورفت شروع ہوئی، وہاں مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی بھی تشریف لایا کرتے تھے، میں نے دونوں کو نظام الدین آنے کی دعوت دی، اور دونوں حضرات میری دعوت پر وہاں تشریف لائے، میں نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مفتی صاحب کے بارے میں یہ بلند الفاظ سُنے تھے، فرماتے تھے کہ "حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی فقہی صلاحیت اور نظر پر بڑا اعتماد تھا، اور وہ ان کے فقہی جوابات سے مطمئن ہوتے تھے، مجھے ان کا فقہ و افتاء کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول ہونا، اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ان کو اس فن سے خصوصی مناسبت اور امتیاز حاصل ہے"۔

مفتی صاحب سے اصل ربط و تعلق ۱۹۴۳ء سے شروع ہوا، اس وقت "ندوۃ المصنفین"، قرولباغ دہلی میں تھی، حُسنِ اتفاق کہ اس زمانہ میں اس کے مرکز کے قریب ہی میرے والد مرحوم کے ایک مخلص دوست عم مخدوم و محترم الحاج سید محمد خلیل صاحب ہنٹوری مرحوم مقیم تھے، ان کے صاحبزادۂ گرامی قدر برادرِ محترم سید محمد جمیل صاحب (جو بعد میں پورے پاکستان کے اکاؤنٹینٹ جنرل ہوئے) ریلوے کے آڈیٹر تھے اور ایک زمانہ میں دہلی میں انکی پوسٹنگ تھی، اس تعلق و مناسبت سے میرا بار بار وہاں

آنا جانا ہوتا تھا، سید محمد خلیل صاحب اور سید محمد جمیل صاحب دونوں مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اور ندوۃ المصنفین سے ربط و تعلق رکھتے تھے، اسی زمانہ میں مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ جو حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانی مدرسہ و مصنف "اظہار الحق" کے خاندان کے چشم و چراغ اور "آثار رحمۃ اللہ" میں سے تھے، بعض سیاسی حالات و مصالح کی بنا پر مکہ مکرمہ سے آکر قرولباغ دہلی میں اسی ماحول و جوار میں جس کا تذکرہ کیا گیا مقیم تھے، یہیں سے وہ رسالہ "ندائے حرم" کی ادارت و اشاعت بھی فرماتے تھے۔ اور مدرسہ صولتیہ کی رہنمائی و نگرانی بھی، اتفاق سے انہیں دنوں ہمارے مخدوم مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی ایم۔ اے علیگ بھی دہلی میں مقیم تھے اور ان کا زیادہ وقت یہیں گزرتا تھا، وہ مجھ پر خاص کرم فرماتے تھے، اور مجھے بھی ان سے بڑی موانست و مناسبت تھی، میں قرولباغ جاتا تو آدھے دن رہ جاتا، علم و ادب، زندہ دلی اور مجلس آرائی، چشم و گوش اور کام و دہن سب کی لذت سب کا سامان ایک جگہ بہم ہوتا مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب بھی شریکِ بزم ہوتے، انھوں نے کبھی اپنی قیام گاہ پر بلا کر کھانے کی ضیافت بھی فرمائی۔

اس کے بعد مفتی صاحب سے صرف اہم اجتماعات میں ملاقات ہوتی، مثلاً بمبئی کا تعلیمی کنونشن جو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ۱۹۵۵ء میں بلایا تھا تقسیم ہند کے بعد جمعیۃ العلماء کا پہلا جلسہ جو ۱۳۶۷ھ (اپریل ۱۹۴۸ء) میں مولانا مدنیؒ کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ اور اس کے اکثر مہمان دار العلوم ندوۃ العلماء میں مقیم تھے نومبر ۱۹۵۳ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا پاکستان میں حادثہ ارتحال پیش آیا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں ہم نیازمندوں نے مولانا کی یاد میں ۱۹۵۴ء میں ایک سنجیدہ اور علمی اجتماع منعقد کیا جس کی شرکت کے لئے ضعف و علالت کے باوجود مولانا سید

مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم اپنے وطن سے لکھنؤ تشریف لائے، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اپنی شرافت نفس، سید صاحب کے ساتھ تعلقات، اور دار المصنفین ندوۃ المصنفین کے علمی و رسمی رشتہ و اشتراک کی بناء پر کیسے شرکت نہ فرماتے؟ تشریف لائے اور بڑے ذوق و دلچسپی کے ساتھ پورے اجتماع میں شریک رہے، سید صاحب کا ہندوستان کو خیرباد کہہ کر پاکستان تشریف لے جانا اور وہیں قیام اختیار کر لینا ایک علمی ادبی اور ملّی سانحہ تھا، لیکن حالات اور مجبوریوں اور خانگی نزاکتوں کی "سنگین منطق" میں "دخل در معقولات"، کی کیا گنجائش؟ مفتی صاحب نے اپنے ہی تأثر نہیں بلکہ ہندوستان کی، ملّت اسلامیہ اور علمی و تصنیفی اداروں کی اس ملی جلی حیرت و حسرت کو جس خوبی ذہانت ولطافت کے ساتھ اپنی تعزیتی تقریر میں ادا کیا وہ مفتی صاحب ہی کا حق تھا، اور ذوق و گوش ابھی تک اس کی لذت لے رہے ہیں، مفتی صاحب نے فرمایا کہ "ہم عقیدت مندوں اور نیازمندوں کی تمنا تو یہ تھی کہ سید صاحبؒ کی آخری آرام گاہ یا اپنے محبوب و محسن استاد و مربی علامہ شبلیؒ کے پہلو میں ہوتی، یا اپنے مرکز عقیدت شیخ و مرشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پہلو میں، مگر تقدیر الٰہی کچھ اور تھی ؏

من چناں خواہم، خدا خواہد چنیں

آج بھی اہل ذوق اور محرمان حقیقت اس بلیغ جملہ کا لطف اٹھا سکتے ہیں جس میں مرثیہ کا سوز بھی ہے اور غزل کی لطافت بھی ویسے تو مفتی صاحب کی رفاقت دار العلوم دیوبند کے جلسہ شوریٰ میں اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی میں حاصل ہوتی رہتی تھی لیکن اصلاً مفتی صاحب کی رفاقت اور وسیع و جامع معنی میں خدمت دین و ملت کے میدان میں ہم سفری کی سعادت ۱۹۶۴ء سے حاصل ہوئی۔

جب راوڑکیلا، رانچی، جمشید پور کے فسادات نے ملت کا درد رکھنے والوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ اگر

بروقت اس کا مداوا نہ کیا گیا اور مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں، تنظیموں، اور ان کے قائدین رہنماؤں نے ملت ہی کو نہیں بلکہ ملک کو بچانے کے لئے منظم و متحد جد و جہد کا آغاز اور مشترک پلیٹ فارم کو وجود میں لانے کا کام نہ کیا تو اس ملت پر جو کچھ گذرے گی سو گذرے گی ملک کی بھی خیریت نہیں، اس تأثر کا سب سے زیادہ غلبہ اور اس صدمہ کی چوٹ سب سے زیادہ (خدا مغفرت کرے اور ان کے درجے بلند کرے) ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم کے دل پر تھی، انھوں نے ان سب فکرمند اور دردمند حضرات سے رابطہ قائم کیا جو اس سلسلہ میں ان کے ہم سفر ہو سکتے تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے دہلی میں ہونے کی وجہ سے ان کا سب سے زیادہ اور پہلا ربط مفتی صاحب اور مولوی محمد مسلم صاحب ایڈیٹر "دعوت"، سے رہا، باہر کے لوگوں میں راقم سطور اور مولانا محمد منظور صاحب سے

اس سلسلہ کا پہلا قدم مشاورت کا وہ تاسیسی جلسہ تھا جو ۸، ۹ / اگست ۱۹۶۴ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا، اور جس کے نتیجہ میں مسلم مجلس مشاورت وجود میں آئی، اسی جلسہ میں طے پایا کہ ملک کی فضا کو درست کرنے اور احترام انسانیت اور امن آشتی کا پیغام پہونچانے اور بجائے سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے (جن کے ذہن بہت کچھ مسموم ہو چکے ہیں) ملک کی عام آبادی اور ہندو مسلم عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کیا جائے، اس کے ساتھ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کیجائے اور ان کو محسوس کرایا جائے، کہ وہ دین حق اور خدا کے آخری پیغام کے حامل، انسانیت کے بے لوث خادم و معمار ہونے اور اپنی ان خصوصیات اور دینی ذمہ داریوں کی بنیاد پر اس ملک کے محافظ و پاسبان بھی ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلا سفر بہار و اڑلیسہ کا ہوا، اور ایک موقر اور متنوع الافراد وفد نے ستمبر ۱۹۶۴ء میں رانچی، چکر دھر پور، چائباسہ، جمشید پور، اور راوڑکیلا کا دورہ کیا۔ ہر جگہ وفد کا شاندار اور پر جوش استقبال ہوا، مقرروں میں ڈاکٹر صاحب

کے بعد مفتی صاحب پیش پیش اور نمایاں ہوتے تھے۔ نومبر ۶۴ء میں مجلس نے مہاراشٹر کا دورہ کیا، دسمبر ۶۴ء میں گجرات کا دورہ ہوا۔ جسمیں پنڈت سندر لال بھی شریک تھے اس سفر میں پالن پور، احمد آباد، نڈیاڈ، گودھرا، بڑودہ، سورت اور بھڑوچ پر یہ پروگرام اختتام کو پہونچا، گجرات کے دورہ کا ذکر آگیا ہے تو دو واقعات کے تذکرہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ احمد آباد کے قریب ایک مرکزی اور اہم قصبہ میں جس کا نام (اگر حافظہ کوتاہی نہیں کرتا) بیس نگر تھا، میں نے منتظمین جلسہ اور رفقائے سفر سے درخواست کی کہ چونکہ میں کئی راتوں سے دیر میں سو رہا ہوں اور بہت تھکا ہوا ہوں مجھے تقریر کا پہلے موقعہ دیدیا جائے، ذمہ داروں نے منظور کرلیا، اور پہلی تقریر میری ہوئی میں نے اس تقریر میں ہندوستان کی جغرافیائی وسعت، تاریخی عظمت اور سیاسی اہمیت وغیرہ بیان کرنے کے بعد ایک محب وطن ہندوستانی کی حیثیت سے اس پر حسرت وقلق کا اظہار کیا کہ اتنے عظیم ملک کی قیادت اور انتظام کے لئے ملک کے آزاد ہونے کے بعد جس بالغ سیاسی شعور، وسیع النظری، سیرت واخلاق کی بلندی اور اصول پسندی کی ضرورت تھی، اسکی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے، شاید جنگ آزادی کی مصروفیت میں قومی سیرت واخلاق کی تعمیر کا وہ کام نہیں ہوسکا، جس کی اتنے بڑے ملک کے سنبھالنے کیلئے ضرورت تھی، ملک میں ذہنی واخلاقی انتشار، دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور رشوت وکرپشن پھیلا ہوا ہے، ملک کے بے لوث کارکنوں، سیاسی رہنماؤں، اور قائدین کو اسکی طرف توجہ کی ضرورت ہے، ورنہ اس آزادی کا برقرار رہنا مشکل ہوجائے گا میں یہ تقریر کرکے اپنی قیام گاہ پر آگیا، واپسی پر ملّا جان صاحب نے بتایا (جو تحریک خلافت کے ایک پرانے کارکن اور مجلس مشاورت کے ایک اہم رکن تھے اور کلکتہ میں ان کا قیام تھا) کہ تمہاری تقریر پر پنڈت سندر لال جی نے سخت تنقید اور احتجاج کیا، اور کہا کہ مولانا کو اتنے